عذرا یاسمین
پی ایچ ڈی اسکالر
شعبۂ اردو، بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان
ڈاکٹر قاضی عبدالرحمٰن عابد
پروفیسر شعبۂ اردو، بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان

مشرق بطور مغرب کی بازیافت
(احساسِ برتری، نفرت وتضحیک، توازن)

ABSTRACT

"Regaining of East as West (Sense of Superiority, Hatred or Humiliation, Balance)".
By Azra Yasmeen, PhD scholar, Department of Urdu, Bahauddin Zakaria University, Multan.
By Dr. Qazi Abdur Rahman Abid, Professor, Department of Urdu, Bahauddin Zakaria University, Multan

East and West are no geographical boundaries but symbols of two different mindsets and attitudes. Descriptive / explained boundaries are decided on the basis of civilization between East and West and this division was created when Europeans broke their relation / link from the concept of reality in the reign of Renaissance. At the same time, they did not hesitate to violate and destroy the history, culture, independence and greatness of East to create/widen their States and impose their powers. As a result of this, people of East especially of Indian sub-continent became a victim of complex. In this article, different opinions will be understood about East as regain of West in the light of sense of superiority, hatred or humiliation and balance.

Key words: East, West, Renaissance, regaining, sense of superiority, hatred & ridicule, balance, orientalists

نشاۃ الثانیہ کے بعد مغربی اقوام نے جوں ہی تاریخ میں قدم رکھا انھوں نے توسیع پسندانہ نقطۂ نظر اپناتے ہوئے حکومت بنانے کی اہلیت کا اظہار کرنا شروع کر دیا اور اس سلسلے میں مشرقی ممالک کے وسائل کو اپنے تصرف میں لانے کے لیے ان پر قبضہ کرنے کی منصوبہ بندی کی اور اس میں کامیاب بھی ہوئے اور مشرق خصوصاً برصغیر میں انگریزوں کی آمد اور حکومت

کے دوران میں زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلیاں رونما ہوئیں اور کئی فکری جہتیں سامنے آئیں جن سے لوگوں کی نفسیات پر گہرا اثر پڑا۔ ان میں کئی رویے نمایاں تھے جن میں مغربی مفکرین اور مستشرقین کی آراء کو اہمیت حاصل تھی جنھوں نے مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا تجزیہ کرتے ہوئے مغرب کو افضل اور برتر قرار دیا اور مشرق (برصغیر) کو پسماندہ، غیر متحرک، آمرانہ مزاج کا حامل اور اس کے فرد کو بطور 'شے' پیش کیا۔

دوسرے وہ لوگ جو مغرب کے سخت ترین اور سفاک نقاد تھے، ان میں مزاحمت کرنے والے لوگ بھی شامل تھے جو ان سب سے الگ ہو کر بیٹھ گئے اور ایسے میں ہندوستان میں دانشوروں کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو مذہب اور بنیادی تصورات سے بے توجہی کو آفاقیت اور روشن خیالی سمجھتے ہوئے نو آبادکاروں کے کارناموں پر نا صرف مداح سرا تھا بلکہ انھیں اپنا محسن خیال کرتا تھا۔

اسی طرح سرسید احمد خاں کے زیر اثر پروان چڑھنے والی سوچ تھی جن کے نزدیک مغرب کی پیروی اور روشن خیالی سے ہی اہلِ ہندوستان ترقی کی منازل طے کر سکتے ہیں۔ ان سب کے درمیان متوازن تصورات رکھنے والا طبقہ بھی موجود تھا جو مرعوبیت کا شکار نہیں ہوا نہ ان میں احساسِ تفاخر تھا اور انھوں نے برصغیر کی متوازن تصویر پیش کی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے احساسِ برتری اور تفاخر کے حوالے سے اہلِ مغرب کے مفکرین اور مستشرقین کا رویہ سرِفہرست تھا۔ برطانوی سامراج خود کو اعلیٰ اور برتر نسل سمجھتے تھے اور خود کو دیسی باشندوں پر فوقیت دیتے تھے اور ان کو تسخیر کرنے کا اخلاقی جواز بھی پیش کرتے تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی مسخ شدہ تصویر پیش کی جہاں ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ حکومتوں میں استحکام نہ ہونے کے باعث لوگ تباہ حالی کا شکار تھے اور مذہبی توہمات میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ ایسے میں انگریزوں نے نا صرف انھیں تحفظ بخشا بلکہ ہندوستان کے طاقتور طبقوں کے معلمانِ اخلاق اور مشیرانِ قوم کو اپنے ساتھ ملا لیا اور کسی حد تک تعلیم یافتہ طبقے کی حمایت بھی حاصل کی اور یوں حکومتی نمائندے جبر کی زبان بولنے لگے۔

> ''آبادکار تاریخ بناتا ہے اور اسے بتانے کا شعور رکھتا ہے اور متواتر اپنے وطن کی تاریخ کا حوالہ ذہن میں ہونے کے باعث وہ خود کو مادرِ وطن کی توسیع سمجھتا ہے چناں چہ وہ اس ملک کی تاریخ نہیں لکھتا جہاں وہ لوٹ مار کرتا ہے بلکہ اپنی ہی قوم کی تاریخ لکھتا ہے۔''(۱)

برطانوی دور میں بنائے گئے نظامِ تعلیم میں طلبہ کو انگریزی زبان میں تعلیم دے کر ان میں احساسِ کمتری پیدا کیا گیا اور اپنی تہذیب کی برتری ثابت کی گئی اور انگریزوں نے خود کو ہندوستان کا نجات دہندہ قرار دیا۔

> ''خدا نے ہندوستان کو انگریزوں کے حوالے کیا ہے تا کہ وہ اس کی حفاظت کریں۔''(۲)

انگریزوں سے مرعوب و متاثر طبقہ نے بھی اس موقف کی تائید کی کہ اہلِ ہندوستان استحصال کا شکار تھے اور

انگریزی حکومت یہاں کے لوگوں کے لیے ایک انعام کی حیثیت رکھتی ہے۔ سرسید احمد خان نے اپنی تقریر میں نا صرف انگریز حکمرانوں کی انتظامی صلاحیتوں کو سراہا بلکہ ان کے اقتدار کو اہل ہندوستان کی خوش قسمتی قرار دیا کیوں کہ ان کا زیادہ تر طرزِ حکومت عقلی قوانین پر مشتمل تھا۔ برہموسماج کے بانی راجا رام موہن نے تو مرعوبیت کا اظہار اس حد تک کر دیا:۔

''ہندوستان میں انگریزوں کا آنا خدا کی حکمت عملی ہے۔ وہ ان کے ہاتھوں اپنے مقاصد کی تکمیل کر رہا ہے۔ اس لیے اہلِ ہندوستان کو انگریزی حکومت کا شکر گزار ہونا چاہیے۔''(۳)

ہندوستان میں انگریزوں کو مشرقی زبانیں پڑھانا اور مختلف کتب کا انگریزی زبان میں ترجمہ کا مقصد یہ تھا کہ مقامی لوگوں کی ذہنیت، نفسیات اور اقدار کو سمجھا جائے اور ان کی زبان کے مطالعہ سے ان کے خیالات تک نا صرف رسائی حاصل کی بلکہ تحقیق و مطالعہ سے ان لوگوں کو ذہنی غلام بنایا۔ اپنے منصوبوں پر آزاد سوچ کی چھاپ لگائی اور اچھی شہرت رکھنے والے دانش وروں کو نمائندگی دی تا کہ وہ پس پردہ حکمرانوں کے مقاصد کی تکمیل کرتے رہیں اور بظاہر اپنے لوگوں کے خیر خواہ ہوں۔

ٹیگور نے کہا:

''قصور مغربی ثقافت کا نہیں بلکہ ایک قوم کے دانش ورانہ چھوٹے پن کا ہے جس نے مشرق پر تنقید کرنے کی گورے کی ذمے داری اپنے کندھوں پر اٹھائی۔''(۴)

اہلِ یورپ میں احساسِ برتری نمایاں تھا وہ مقامی باشندوں کو کام چور، دھوکا باز اور جھوٹ بولنے والے قرار دیتے تھے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ وہ ان کے لیے آزادی کے خواب کو ناممکن بنا دینا چاہتے تھے اور اس کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈوں کو استعمال کیا اگرچہ ہندوستان بطور نوآبادی برطانیہ کے لیے آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تھا تاہم یہیں پیدا ہونے اور پرورش پانے والے کپلنگ نے بھی اسے بے زماں اور بے تغیر ہی بنا کر پیش کیا۔

اہلِ یورپ کے نزدیک دیسی باشندوں کی تسخیر اور ان پر برتری کی وجہ ان کی افضلیت تھی اور وہ انسانیت کی سمت متعین کرنے کا حق رکھنے کا دعویٰ بھی کرتے نظر آتے ہیں۔

بقول کونرڈ:

''ہم اہلِ مغرب فیصلہ کریں گے کہ کون ایک اچھا دیسی ہے اور کون برا۔ کیوں کہ تمام دیسی باشندے ہماری تسلیم کی حقیقت کے تحت خاطر خواہ وجود رکھتے ہیں ہم نے انھیں تخلیق کیا، انھیں بولنا اور سوچنا سکھایا اور جب وہ بغاوت کرتے ہیں تو انھیں نادان بچے سمجھنے کے ہمارے خیالات کی ہی توثیق کرتے ہیں۔''(۵)

طنز و تضحیک

نوآبادکاروں نے مقامی ہندوستانی کو کمتر اور گھٹیا قرار دیتے ہوئے حقیر قرار دیا۔ جے ایس مل جو ایک عرصہ تک

انڈیا آفس کا کارکن رہا۔ اپنے مقالہ میں رائے دی:۔

''اس کے نظریات اور خیالات ہندوستان میں قابلِ اجرا نہیں ہیں کیوں کہ اہلِ ہند نسلی لحاظ سے نہ سہی تہذیبی لحاظ سے گھٹیا ہیں۔''(۶)

نوآبادکاروں کے رہائشی علاقے صاف ستھرے اور عام آبادی سے دور ہوتے تھے وہ مقامی لوگوں کو اپنے قریب نہیں آنے دیتے تھے اور انھیں گھٹیا اور بدقماش قرار دیتے تھے اور مقامی باشندے بھوکے اور پسماندہ دنیا کے باسی تھے جہاں غربت کا راج اور روایتی سرداروں اور جاگیرداروں کی اجارہ داری تھی جو ان مقامی لوگوں کو لاعلم رکھنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے تھے تاکہ ان کا رعب اور دبدبہ قائم رہے اور یوں نفسیاتی طور پر اہلِ ہندوستان اپنی تہذیب اور اقدار سے دور ہوتے چلے گئے اور ایک تصور یہ بھی ابھرا کہ جب ہم مشرق اور اس کی اقدار کی بات کرتے ہیں تو گویا ہم مغرب کی مادی ترقی، سائنس اور ٹیکنالوجی جیسے تصورات کے برعکس جمود اور بے عملی کی طرف راغب ہیں اور اہلِ ہندوستان سائنسی ترقی چاہتے ہی نہیں اور نہ ان میں اس کی اہلیت ہے گویا یوں وہ مغرب کی اس سازش کا شکار ہوگئے اور جب کوئی معاشرہ ٹوٹنے لگتا ہے تو پھر افراد کی زندگی انتشار کا شکار ہوجاتی ہے اس کا توازن برقرار نہیں رہتا اور پھر ایک نئی صورتحال جنم لیتی ہے جس میں مفاد پرست طبقہ جن میں نودولتیہ، عامیانہ پن، نوکرشاہی اور کٹھ ملائیت شامل ہیں، کے اثرات نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

دراصل مغربی تہذیب منظم منصوبہ بندی سے اہلِ ہندوستان کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرکے اس کی انفرادیت چھین کر اسے انگریزی تہذیب کا غلام بنا رہی تھی اور یوں اہلِ ہندوستان کی قدر و منزلت اور وقعت کم ہوتی جارہی تھی۔

ونسٹن چرچل نے بطور اپوزیشن لیڈر برصغیر کی آزادی کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر پچاس برس مزید ہندوستان کو اپنے قبضے میں رکھا جائے تب بھی ان میں آزادی حاصل کرنے کی جرات پیدا نہیں ہوگی۔

اہلِ ہندوستان کے بارے میں اہلِ مغرب کی رائے متعصّبانہ تھی وہ سمجھتے تھے کہ انھیں سماجی شعور نہیں ہے یہ لوگ کاہل، سست اور جھوٹے ہیں وہ ان کے لباس، روایات اور کھانوں تک کو طنز و تضحیک کا نشانہ بناتے تھے۔

''مشرق کا آدمی غیر منطقی، گرا پڑا، بچوں جیسا اور مختلف ہے جبکہ یورپ کا انسان منطقی، نیک اور بالغ نظر ہے اور متوازی ہے۔''(۷)

اہلِ مغرب نے مشرق کے انسان کو بطور 'شے' دنیا کی عدالت میں پیش کیا اور جو قطعیت اور شرافت کے الٹ ہیں جن میں جھوٹ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے جبکہ ان کے مقابلے میں مغرب تہذیب یافتہ، انسان نواز، منطقی اور ترقی یافتہ ہے اور یوں اپنی فراست اور من گھڑت تفسیر سے ہندوستان کی تاریخ مسخ کرنے کی کوشش کی گئی۔

سامراجی دور میں انگریز افسران کو ہمیشہ چاک و چوبند نظر آنا ضروری تھا اور عمر کے پچاس سال ہونے پر انھیں واپس انگلستان بلا لیا جاتا تھا وہ بند جوتے پہنتے تھے۔ مقامی لوگوں کو اپنے قریب نہیں آنے دیتے تھے۔ ان کے لباس اور

خوراک کو مقبولیت حاصل ہونے لگی۔ محکوم قوموں کی تہذیبوں اور روایات کو طنز کا نشانہ بنایا گیا، مقامی زبانوں پر پابندی لگا دی گئی جس سے عوام و خواص احساسِ کمتری کا شکار ہو گئے۔

''انگریز عہدے داروں نے یہ اصول مقرر کر رکھے تھے کہ جب ہندوستانی آفس آئیں تو جوتے اتار کر آئیں اگر راستہ میں صاحب کو آتے دیکھیں تو سڑک کے ایک طرف کھڑے ہو جائیں اور سر جھکا لیں۔''(۸)

ہندوستانیوں کے بارے میں اہلِ مغرب نے اپنے ناولوں میں بھی یک رخی اور منفی تصویر پیش کی ہے کہ یہ لوگ نہ تو سچ بولتے ہیں نہ ہی ان میں اخلاقی جرات ہے۔ انھیں بلند معیار زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ان کے لیے تمام وقت ایک جیسا ہے اور شور شرابا ان کی زندگی کا حصہ ہے۔ ان منفی پہلوؤں کو مدنظر رکھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کو معمولی باتوں پر پھانسی دے دی جاتی، سیاسی لوگوں کو کالے پانی کی سزا دی جاتی۔

جلیانوالہ باغ میں احتجاج پر لوگوں کا قتلِ عام کروایا گیا انھیں ریل کے ڈبوں سے باہر پھینکوایا گیا اور نسل پرستی کو فروغ دیا گیا اور دیسی لوگوں کو اہلِ یورپ کے کلبوں سے دور رکھا گیا۔ ان کے ساتھ میل ملاپ کو رواج نہیں دیا گیا کہ کہیں وہ بھی ہندوستان میں دیگر حملہ آوروں کی مانند پر اپنی انفرادیت نہ کھو دیں انھیں اعلیٰ ملازمتیں نہ دینے کی سفارش کی گئی کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ مقامی لوگ نا صرف اخلاقی طور پر پس ماندہ ہیں بلکہ بدعنوان بھی ہیں۔

جیمس گرانٹ نے کہا:

> ''یہ جاہل، بدتمیز اور بے ہودہ ہیں۔ یہ اس حد تک بگڑے ہوئے ہیں کہ ان کی اصلاح بھی نہیں کی جاسکتی۔۔۔۔ جب ان کے مادی مفادات آتے ہیں تو یہ ہر اخلاقی حد بھول جاتے ہیں جہاں تک ایمانداری کا تعلق ہے تو وہ ان میں نام کو نہیں۔''(۹)

دراصل نوآبادیاتی قوتوں نے مقامی باشندوں کو انسانیت کے درجے سے گرا دیا اور ان کے مقابلے میں خود کو برتر، مہذب اور افضل قرار دیا اور یہ طے کر لیا کہ خدا نے انھیں فتح دی ہے اور مقامی لوگوں کو ان کا محکوم بنایا ہے۔ اس لیے برتری کی بنا پر فرض ہے کہ ان کی زمینوں، جائیدادوں پر قبضہ کر لیں ان کے مال و دولت چھین لیں اور ان سے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کام لیں اور ان میں انکار کی گنجائش نہ ہو ورنہ اس کو غداری سمجھا جائے گا جس کی سزا قتل، اذیت دینا، اخلاقی طور پر درست تصور کیا جاتا ہے۔

دراصل انگریز عہدیدار اہلِ ہندوستان کو اپنے تجربات کی روشنی میں دیکھتے تھے جب ان کی زمینوں پر قبضہ کیا جاتا اور ٹیکسوں کی وصولی کے لیے ان پر سختی کی جاتی اور مقدموں میں الجھایا جاتا تو وہ قانونی موشگافیوں سے بچنے کے لیے مزاحمت کے جو طریقے اختیار کرتے۔ ان میں جھوٹ بولنا، جھوٹی گواہی دینا اور مختلف حیلوں، بہانوں سے حکومتی اقدامات سے بچنا شامل ہوتا تھا۔ ان کی مزاحمتی تدابیر کو انگریز ان کے کردار کی خرابیاں گردانتے تھے اور اس معیار پر پوری ہندوستانی قوم کو پرکھتے تھے:

''موسم، بدمعاشی، ظلم، جاہلیت اور اجنبیوں سے نفرت۔۔۔۔ ان سب عناصر ہی نے غربت پھیلانے میں اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے۔۔۔۔ ان کے لیڈروں کو زر کے عوض خریدا جاتا۔ ان کی تہذیبوں کا مذاق اڑایا جاتا اور ان کی زبانوں کے استعمال پر پابندیاں لگائی جاتیں۔ نوآبادیاتی قوتوں نے اپنی رعایا میں جان بوجھ کر شدید احساسِ کمتری پیدا کر دیا تھا۔''(۱۰)

توازن

وقت گزرنے کے ساتھ اہلِ مغرب اور برصغیر کے دانشوروں میں یہ احساس پیدا ہو رہا تھا کہ اب محکوموں میں بیداری کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے ہیں اور اب تیسری دنیا خود کو پانے کی طرف آگے بڑھ رہی ہے اور ابھرنے والی نئی نسل کو مسائل اور حقیقت کا ادراک ہو رہا تھا اور اب مقامی باشندے استعماری نظام میں رہتے ہوئے اپنی غلامانہ حیثیت کو جان چکے تھے۔ وہ اس حقیقت کا اقرار کرتے تھے کہ نوآبادکاروں نے یقیناً مفید قوانین بنائے، سڑکوں کا جال بچھایا، پانی کے کنویں اور تالاب بنوائے۔ شفاخانے، کالج یونی ورسٹیاں قائم کیں اور تمام مذاہب کے لوگوں کو یکساں مذہبی آزادی دی۔ قحط کے دنوں میں اناج کو محفوظ اور مناسب ترسیل سے لاکھوں لوگوں کو مرنے سے بچالیا۔ متعدی امراض سے بچاؤ کے اقدامات کیے مگر ان سب کے باوجود وہ یہ بھی جان چکے تھے کہ نوآبادکار ہمارے خیر خواہ نہیں۔

وارن ہیسٹنگز ہندوستان میں مشرقی علوم کے سرپرست بن گئے۔ سر ولیم جونز نے ایشیاٹک سوسائٹی، کی بنیاد رکھی، کالبروک نے خواتین کے لیے گھریلو صنعت کے قیام اور فروغ کی تجاویز دیں۔ دو قسم کا عدالتی نظام شروع ہوا، اسی دور میں اردو زبان کی ترویج و ترقی کی طرف توجہ دی گئی۔ مغربی ادب کو تمام زبانوں میں سمونے کی کوشش کی گئی، اخبارات مقامی زبان میں شائع ہونے لگے روئی کی کاشت کے لیے وسیع پیمانے پر کارخانے لگائے گئے وکالت اور قانون کے پیشے میں ہندوستانی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے، کام کا دورانیہ مقرر ہوا۔

ایسے میں تعلیم یافتہ نسل کے جن لوگوں نے متوازن اندازِ فکر اپنایا ان میں مولوی چراغ علی، شبلی، سید امیر علی اور عبداللہ یوسف علی نمایاں ہیں اور انھوں نے اس بات کا برملا اظہار کیا کہ شکست کے بعد ہم پر بہتر قوم کی حکومت آئی ہے اور ہمیں چاہیے کہ ہم خود کو بہتر بنائیں اور پھر ایک نئی فکری لہر بیدار ہوئی کہ ہمیں اپنی خامیوں کی نشاندہی کرنے کے بعد انھیں دور کرنا چاہیے اور بدلتے ہوئے حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اصلاح کے ذریعے معاشرے میں بہتری لائی جائے اور اسی دور میں ایک نقطۂ نظر یہ بھی تھا کہ اس دور میں مغربی اور مشرقی افکار و خیالات کے ملاپ سے جو ثقافت وجود میں آئی۔ اس نے ہندوستان کے منجمد معاشرے کو متحرک کیا اور ہندوستان برطانیہ کی نوآبادیات ہونے کی وجہ سے جدیدیت سے روشناس ہوا اور مشرقی علوم پر نئی تحقیق نے انھیں ایک نئی زندگی اور نئی جہت دی۔ یورپی سائنس، فلسفہ اور دوسرے سماجی علوم نے عقلیت کو

بڑھاوا دیا اور مغربی تہذیب کی مادیت نے عام فرد کی زندگی میں خوش حالی و مسرت حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔

ایسے میں متضاد آراء بھی سامنے آئیں وہ لوگ جو جدید مغربی نظریات کے ماننے والے تھے اور اپنی روایات سے بھی جڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے انگریز حکومت اور اس کے اقدامات کو بلا سوچے سمجھے تسلیم نہیں کیا بلکہ وہ اس کی خوبیوں اور خامیوں پر غور کر رہے تھے کہ ہندوستانی معاشرے کی اصلاح کیسے کی جائے کیا اسے یورپ کے ماڈل میں ڈھالا جائے یا قدیم روایات سے رشتہ جوڑتے ہوئے آگے بڑھا جائے انھی رجحانات نے قدامت پرستی اور روشن خیالی کی تحریکوں کو جنم دیا گویا ہندوستانی ذہنی طور پر منجمد نہ تھے بلکہ سوچ اور فکر سے نئی راہیں تلاش کر رہے تھے۔

اٹھارویں صدی میں مفکر رام چندر نپت نے انگریزوں کے عزائم بھانپتے ہوئے اپنی کتاب ''اجن پترا'' میں لکھا کہ ان ٹوپی والوں کے عزائم ہیں کہ وہ علاقوں میں داخل ہو کر قبضہ کر کے اپنا مذہب پھیلائیں۔ ان کے بارے میں انھوں نے رائے دی کہ یہ سرکش نسل جہاں قبضہ کر لیتی ہے تو اسے چھوڑتی نہیں اس لیے انھیں سمندر کے قریب کوٹھیاں بنانے کی اجازت نہ دی جائے اور ان کی آمد و رفت پر نظر رکھی جائے اور اگر ان کا مقصد محض تجارت ہے تو پھر ان سے تعاون کیا جائے، ورنہ نہیں اسی طرح ۱۸۴۱ء میں بمبئی گزٹ میں ایک خط شائع ہوا۔ جس میں ان کی عیاریوں کا پردہ چاک کیا گیا۔ اس تمام صورتحال میں جہاں ایک طرف مراعات یافتہ طبقہ تھا جسے انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا تو دوسری طرف بدلتی صورتحال پر کڑی نگاہ رکھنے والے متوازن سوچ کے حامل دانشور بھی موجود تھے جو ان دولت مند اور مراعات یافتہ طبقات اور ان کی خوشامد و تعریف کرنے والوں کی حدود سے باہر پھیلی ہوئی دنیا کی مایوسی، بے چینی اور خوف کو نا صرف سمجھتے تھے بلکہ ان راستوں پر چلنے والے قدموں کا رخ موڑنے اور روشن خیالی کی اقدار، آزادی اور انسانی حقوق کے احترام کی بحالی کے لیے رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا اور اس سلسلے میں پہلا قدم یہی ہے کہ بگاڑ، لاعلمی، دھوکا بازی کی دھول صاف کر کے سچ اور حقیقت تک رسائی حاصل کی جائے اور پھر اس سچ کی روشنی میں دنیا اور حقائق کو پرکھ کر اصل شکل میں واپس لایا جائے۔

ایسے میں انگریزی اقتدار کے دوران میں ہی فرد اپنی زندگی کی پیچیدگیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا تاکہ وہ اپنی ذمے داری اور اخلاقی معیار کو درست انداز میں فعال بنائے۔

اقبال احمد طلباء کو نصیحت کرتے تھے کہ جب تمھیں معلوم ہو کہ تمھارا سچ اس سچ سے متصادم ہے جسے سچ کے نام پر پھیلایا جا رہا ہے تو فوراً رُک جاؤ اور مداخلت کرو۔ چناں چہ اب مطالعہ کرو اور متبادل ذرائع ڈھونڈو۔

اسی طرح ایڈورڈ ڈبلیو سعید نے درس دیا کہ ماضی کی مسخ شدہ تصویروں کو قبول نہ کریں اور اپنے ماضی کی بازیافت کریں اور ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اہلِ مشرق خود شناسی کا راستہ اختیار کریں۔ مغرب کی مرکزیت کی نفی کرتے ہوئے اپنے ماضی کو اپنے حوالوں سے سمجھیں اور سمجھائیں۔

اس حقیقت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مشرق پر تحقیق کرتے ہوئے مطالعہ وسیع اور عالمی تناظر میں کیا جائے کہ مشرق

ایک زندہ حقیقت ہے جو حکمت سے بھرپور ہے جہاں یورپی دانشوروں، مستشرقین اور مغربی اقوام نے اپنی حکومت بنانے اور اجارہ داری قائم کرنے کے لیے اس کی تاریخ، عظمت اور تہذیبوں کو تباہ کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔

ایسے میں یورپ میں یہ تصور بھی پروان چڑھا کہ ہندوستان کی تاریخ کو از سرنو دیکھنے اور اس کے باشندوں کو ان کی توقیر ذات لوٹانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نا صرف آزادانہ رویہ اپنائیں بلکہ اپنے وجود کی شناخت کریں۔

اس تناظر میں ایسا ادب تخلیق ہونے لگا جس میں اخلاقیات، سماجیات، روایات اور معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا گیا، حکمرانوں کی منظم چالوں، ناانصافیوں اور بے رحمی کا پردہ چاک کیا گیا اور اب اہلِ ہندوستان اس حقیقت سے آشنا ہو چکے تھے کہ ادیب اور دانشور اگرچہ انسان کے درد، رنج و غم کو دور نہیں کر سکتے مگر معاشرے کے افراد کی درست سمت متعین کر سکتے ہیں۔

گویا ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مشرق بطور مغرب کی بازیافت، میں جو مختلف رویے کارفرما رہے وہ معاشرے میں ترویج پانے والے رویوں اور سوچ کی عکاسی کرتے ہیں۔ اہلِ مغرب کے مفکرین اور مشرقی دانشوروں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ہندوستان، ہندوستانیوں کو دیکھا اور آراء قائم کیں۔

حاکم ہمیشہ محکوم پر غاصبانہ رویہ رکھتا ہے اور مغربی مفکرین نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے تمام ہتھکنڈے اپنائے مگر ان میں احساسِ برتری، نفرت و تضحیک کے ساتھ ساتھ توازن کا عنصر بھی نمایاں ہے اور ان تمام رویوں کو اردو ادب کی مختلف اصناف کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے اور اب یہ موجودہ دور کے ادیب کی ذمے داری ہے کہ وہ حقائق کی درست انداز میں غیر جانبداری سے تحقیق و وضاحت کرے اور مشرقی روایات و اقدار، اخلاقیات، مذہب، رسم و رواج اور سماجی رشتوں کی درست انداز میں بازیافت کرے۔

> ''کسی قوم کی تاریخ بتانے میں ادیب کی واضح اہمیت ہے۔ ادیب اپنے دور کا مؤرخ ہوتا ہے وہ ادبی فن پاروں میں اپنے عہد کے احساس و شعور کی تاریخ رقم کرتا ہے۔''(۱۱)

ادب میں ماضی، حال اور مستقبل بولتے ہیں اور ادیب کو بیک وقت ان تینوں زمانوں کا شعور ہونا چاہیے اور وہ تاریخ، جغرافیے کا نا صرف شعور رکھتا ہو بلکہ اسے روایات، نظریہ زندگی کا احساس اور اپنے دور کے معاشی اور معاشرتی تقاضوں کا بھی ادراک حاصل ہوتا کہ وہ مہذب دنیا میں اپنا مقام متعین کر سکے۔ اس کے لیے ہمیں اپنی سوچ، روایات اور تاریخ پر جمی گرد کو جھاڑنا ہوگا تبھی ہم تاریخ میں آگے کی طرف سفر کر سکیں گے اور ہمیں اپنی شناخت کا سراغ صرف ادب کے خزانے سے ہی مل سکتا ہے۔

حواشی

(۱) فرانز فینن، افتادگانِ خاک، مترجم: محمد پرویز، سجاد باقر رضوی (لاہور: نگارشات، ۱۹۹۱ء)، ص ۲۴۶
(۲) ڈاکٹر مبارک علی، برطانوی سامراج: ایک تجزیہ (لاہور: تاریخ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۳۴
(۳) ایضاً، ص ۴۳
(۴) ایڈورڈ ڈبلیو سعید، ثقافت اور سامراج، مترجم: یاسر جواد (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۹۳
(۵) ایضاً، ص ۸
(۶) ایضاً، شرق شناسی، مترجم: محمد عباس (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۶
(۷) ایضاً، ص ۴۲
(۸) ڈاکٹر مبارک علی، برطانوی سامراج: ایک تجزیہ، ص ۶۰
(۹) ایضاً، ص ۵۶
(۱۰) ایلون ٹوفلر، موجِ سوم، مترجم: توحید احمد، ڈاکٹر محمود الرحمٰن (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، اگست ۱۹۹۹ء)، ص ۹۵
(۱۱) سجاد باقر رضوی، تہذیب و تخلیق (لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۹۶ء)، ص ۳۹

مآخذ:

(۱) ٹوفلر، ایلون، موجِ سوم، مترجم: توحید احمد، ڈاکٹر محمود الرحمٰن، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، اگست ۱۹۹۹ء
(۲) رضوی، سجاد باقر، تہذیب و تخلیق، لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۹۶ء
(۳) سعید، ایڈورڈ ڈبلیو، ثقافت اور سامراج، مترجم: یاسر جواد، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۹ء
(۴) ایضاً، شرق شناسی، مترجم: محمد عباس، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء
(۵) علی، مبارک، ڈاکٹر، برطانوی سامراج: ایک تجزیہ، لاہور: تاریخ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص ۳۴
(۶) فینن، فرانز، افتادگانِ خاک، مترجم: محمد پرویز، سجاد باقر رضوی، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۱ء